دوسری صبح جب ڈمپل ناشتہ لے کر آئی تو ملک صاحب غسل خانے میں ماؤتھ واش سے غرارے کر رہے تھے۔ رشّو پلنگ پر بیٹھی ایک انگریزی رسالے میں سے بُننے کا نمونہ دیکھ رہی تھی۔ اور فضا میں بالکل خاموشی اور روزمرّہ پن تھا۔

"کہو!"

"کیا کہوں؟" رشّو نے سر اٹھائے بغیر پوچھا۔

"رات کیسی گذری؟"

"رات؟"

یکدم رشّو کو وہ دن یاد آ گیا جب وہ پہلی بار کالج گئی تھی۔ اس روز پروفیسر اعجاز حسین ایڈیپس کمپلیکس پر لیکچر دے رہے تھے... انہوں نے کلاس میں پرانے عہد نامے کا ایک اقتباس پڑھا تھا کہ

> لوط جب ضغر میں داخل ہوا تب خداوند نے اپنی طرف سے سدوم اور عمورہ پر گندھک اور آگ برسائی۔ اور لوط ضغر سے نکل کر پہاڑ پر جا بسا۔ اور اس کی دونوں بیٹیاں اس کے ساتھ تھیں۔ کیونکہ اسے ضغر میں بستے ڈر لگا۔ اور وہ اور اس کی دونوں بیٹیاں ایک غار میں رہنے لگے۔ تب پہلوٹھی نے چھوٹی سے کہا، ہمارا باپ بڈھا ہے اور زمین پر کوئی مرد نہیں جو دنیا کے دستور کے مطابق ہمارے پاس آئے۔ آؤ ہم اپنے باپ کو مے پلائیں۔ اور اس سے ہم آغوش ہوں تاکہ اپنے باپ سے اپنی نسل باقی رکھیں۔ سو انہوں نے اسی رات اپنے باپ کو مے پلائی اور پہلوٹھی اندر گئی

رشتو پر خفا ہو کر روتا رہا۔ پھر اسے اباجی کے رویّے پر رونا آنے لگا۔۔۔ رفتہ رفتہ وہ اللہ کے خلاف ہو گیا۔ ساری نگری میں ہی اندھیر مچا ہے۔ اللہ اگر ایسا ہی انصاف پسند ایسا ہی حق شناس ہوتا تو ایک کو حبشی اور ایک کو سفید فام کیوں بناتا؟ ایک کی ذہانت ایسی کہ لوگ جینئیس سمجھنے پر مجبور ہوں اور ایک کا دماغ اس قدر خالی کہ گجرات میں مزار پر شاہ دولے کا چوہا بنا بیٹھا ہے۔۔۔۔ آہستہ آہستہ اسے انسان کی مجبوری پر رونا آنے لگا۔۔۔ اللہ میاں نے اپنی تفنّنِ طبع کے لئے یہ کھلونا بنایا اور پھر اسے نیک و بد کی تمیز میں محبوس کر کے اپنے انصاف کے حوالے کر دیا۔ لیکن جب کچھ دیر اپنی اور کل مخلوقِ اللہ پر آنسو بہاتے ہو گئی تو آنسو رک رک کر آنے لگے۔۔۔ اب آنسو ایک بے کیف سے دکھ کا نتیجہ تھے۔۔۔ اس دکھ کا کوئی نام نہ تھا۔ جیسے کرسی میز، پلیہ، ٹرانزسٹر سب دکھ کے سمبل تھے۔۔۔ باہر سڑکوں پر پھیلی ہوئی دھند آہوں کے مرغولے تھے۔۔۔ اونچی اونچی عمارتیں منجمد آنسو تھے۔۔۔ ساری فضا میں دکھ ہی دکھ پھیلا تھا۔۔۔ اپنے بازو سے جب اس نے سر اٹھایا تو کھڑکی سے دھوپ کا پورا تختہ پلنگ پر اتر رہا تھا۔۔۔

ظفو کو یہ دھوپ دیکھ کر پتہ نہیں غازی کیوں یاد آ گیا۔ آنکھوں کو بازو سے پونچھتا وہ نیچے کی طرف چل دیا۔

فِفتھ ایئر کا سارا سال پڑھائی کے معاملے میں غیر خاطر خواہ رہا تھا۔ پہلے پروفیسر ضیاء چلے گئے۔ پھر پروفیسر انجم پورے تین ماہ بیماری کی چھٹی پر رہے۔ پروفیسر اعجاز

حسین جو سائیکلوجی ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ بھی تھے۔ . . ان کے لیکچر طالب علموں کے لئے ایسے نہ تھے کہ وہ ان کی پرستش کرنے لگتے . . .ساری کلاس میں اگر کوئی ان کا مداح تھا تو وہ بے چاری رشیدہ تھی . . . اور اس کی وجہ بھی محض یہ تھی کہ اس نے سب سے پہلے جس کے سامنے سبق لیا وہ پروفیسر اعجاز حسین ہی تھے . . .

سکستھ ایئر میں پہنچتے ہی ساری کلاس میں گڑ کے قوام جیسے جیلے پیدا ہونے لگے . . . لڑکوں کی ٹکڑی جہاں اکٹھی ہوتی، پروفیسروں کے خلاف شکایات کا طومار کھل جاتا . . . لیڈیز روم میں پروفیسروں کی شکایات کے علاوہ اور بہت سے گلے شکوے موجود تھے۔ طرفہ آپس میں چھٹ چکی تھیں . . . کہاں تو دوپٹہ بدل بہنوں کی طرح ہر وقت گل بتیاں ڈالے منقاریں ملاتے پھرتی تھیں۔ کہاں اب یہ عالم تھا کہ ایک کی بات پر دوسری کے ابرو کتھک ناچنے والیوں کی طرح اوپر ہی اوپر کو چڑھتے، ہر لحظہ، ہر لمحہ دونوں ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں کھاتے جاتیں۔ طیبہ اور گلنار میں پہلے رقابت کا رشتہ تھا۔ اور یہ دونوں فرسٹ آنے کی کوشش میں عینکیں لگوا بیٹھی تھیں۔ لیکن اب نہ جانے کیا وجہ تھی کہ دونوں بہت قریب قریب کرسیاں جوڑ کر غٹر غوں غٹر غوں کرتی رہتیں۔ الگ تھلگ بیٹھ کر مونگ پھلیاں کھاتے ہوئے وہ کچھ جنسی قسم کی گفتگو پر آمادہ ہو جاتیں۔ طیبہ گلنار کو اپنے گھر کے رومانس اور گلنار طیبہ کو اپنے علم کے زور پر بہت سی من گھڑت کہانیاں سناتی . . . اس گفتگو میں جا بجا قہقہوں کی پھلجھڑیاں لگائی جاتیں اور جولیس سیزر کے قتل کی سازش کی طرح اس

ں کو سب کے سامنے اور سب سے چھپا کر بڑھایا جاتا۔ زاہدہ مکمل طور پر خارپشت
ں تھی۔ جو پاس آتا اسے اپنے ریڈ انڈین جیسے تیکھے تیروں سے چھید دیتی۔
سود جیسی نرم شخصیت کی زاہدہ دنوں میں یوں خارپشت بن گئی۔ اس کی اصلی وجہ
ل دھچکے تھے۔ جو بیک وقت اس کو لگے۔ اگر صرف ایک رخا زلزلہ آتا تو وہ دھڑام
رتی اور پھر نہ اٹھتی۔ لیکن ہوا یہ کہ چند ثانیے دھرتی دائیں سے بائیں کو ڈولی اور اس
بعد کچھ لمحے زمین نے بائیں سے دائیں کو ڈھکورا لیا۔ اس زلزلے سے جانی اور مالی
صان تو نہ ہوا زاہدہ بھول بھال کر اپنی جگہ قائم ساکن ہو گئی۔ لیکن دل پر اس دو رخے
ے کی ہیبت ایسی طاری تھی کہ ساری شخصیت میں راتوں رات خارپشت کے سے
نکل آئے جو بھی قریب آتا اوئی ماں۔ ہائے اللہ کہہ کر ہٹتا۔

سکستھ ایئر میں داخل ہوتے ابھی پورے تین ماہ بھی نہ ہوئے تھے کہ ایک رات
ک زاہدہ کے اباجی فوت ہو گئے۔ صان نہ گمان یونہی اس جہان سے گذر گئے جیسے
ں غبارے سے ہوا نکل جاتی ہے۔ زاہدہ کے اباجی شہر کے ایک مشہور دندان ساز
تھے اور ان کی دوکان سبزی منڈی کے عین سامنے جہاں سبزیوں سے لدے ٹرک۔
ریکیں لگا کر اور کلچ دبا دبا کر محرابی دروازے سے گذرتے ہیں۔ عین اس جگہ شہر کی
بائیں طرف تھی۔ انستھیسیا لگائے بغیر پچھلی داڑھوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے میں
ے مثل تھے۔ ان کے بنائے ہوئے نقلی دانتوں کا سیٹ جس کے منہ میں ہوتا ہے اس
منہ سے ایسی آوازیں آتیں جیسے گھسے ہوئے دانتوں والی بکری خالی منہ جگالی کر

رہی ہو۔ وہ دندان سازی سائنٹفک طریقے پر کم اور بانہہ بل پر زیادہ کرتے۔
سنا ہے کہ محنت کرنے والے کو اللہ میاں ہمیشہ اپنی جناب سے اجر دیتا ہے۔ دا
کے اس ڈاکٹر کی آمدنی بقدر ہمت اوست تھی۔ خود ڈاکٹر صاحب گیسز کا شکا
کہتے ہیں کہ سبزیوں میں کچھ ایسا عنصر ہوتا ہے کہ معدے میں خود بخود تبخیر پیدا ہوتی ہے
گو ڈاکٹر صاحب بکرے کی سالم ران کھانے والی آسامی تھے۔ اور ان کے گھر میں
پائے، کلیجی، اوجھڑی مغز کی باتیں زیادہ ہوتی تھیں۔ لیکن ہمسائگی کا بڑا اثر ہوتا ہے
سبزی منڈی میں رہ کر گیسز کا ہونا ایک قدرتی بات تھی۔

عجیب سی بات ہے کہ زنبور سے اوزار لئے جو شخص سارا دن جبڑوں پر
اسے گیس کی شکایت ہو۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ جب ان پر اس بیماری کا دورہ پڑتا
فٹ لمبے لحیم شحیم ڈاکٹر کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ جاتے۔ ماتھے پر موتی جیسے
کے قطرے آ جاتے۔ اور وہ گھر والی کو پاس بلا کر نصیحتیں وصیتیں کرنے لگتے۔ کہتے
کہ ڈاکٹر صاحب کے گھر میں سوڈا بائیکارب کا خرچ اس قدر تھا کہ انہیں بوریاں
دو بوری اپنے استعمال کے لئے امپورٹ کرنا پڑتا۔ پھر بھی دورے تھے کہ اب
اور شدید ہونے لگے۔ جس وقت ان کے پیٹ میں ہوا بھر جاتی تو ان کے منہ سے دا
گائے کی سی آوازیں نکلتیں۔ وہ بار بار گھر والوں سے کہتے۔

"ارے برف والے سوئے سے کوئی میرے پیٹ میں سوراخ کر دو۔ ار
کوئی درد والا ہے تو میرے پیٹ میں سوراخ کر دو۔"

لیکن ہوا ان کے پیٹ سے کسی طور خارج نہ ہوتی۔ بہت سونٹھ کے حلوے، ادرک
کے ، اجوائن کے چورن، معجون مرکب، پودینے کے ست کھائے۔ لیکن ہوا پیٹ
میں وقت تک جمی رہتی جب تک اس کا جی چاہتا۔ اس مرض سے تنگ۔ اگر وہ صبح
سے منہ اندھیرے منہ میں مسواک لئے سیر کو بھی جانے لگے تھے۔ رات کو بھی
دو چٹکی ترپھلا کھا کر سوتے۔ لیکن ہوا کی اپنی مرضی تھی۔ جب چاہتی بھر جاتی جب
فٹ بال پنکچر ہو جاتا۔

لیکن اس روز تو سان نہ گمان، زاہدہ کے اباجی کو کسی قسم کی شکایت بھی نہ تھی۔
سے پھوا اُبلی کے تلے ہوئے قتلے اور دو چٹکی ترپھلا کھا کر سر پر ٹوپی پہنی
کھانے خود گئے۔ واپسی پر کہنے لگے پتہ نہیں اب پاؤں کیوں سو جاتے ہیں؟
نے میں زاہدہ کی امّی عشاء کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ سلام پھیر کر بولیں " بڑھاپے
ہے۔" یہ کہا اور پھر نماز کی نیت باندھ لی۔

ان دونوں کی آخری اختلاط بھری بات تھی۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب منہ
میں دے کر سو رہے۔ زاہدہ کی امّی نے پائے دھوئے پھر ان میں مسالہ ڈالا
چولہے پر دیگچہ رکھ کر سو گئیں۔ . . . صبح اٹھیں۔ تو پائے کھانے والا جا چکا تھا۔
اس حادثے کے تیسرے دن ایک اور کربناک بات ہوئی۔ زاہدہ دل ہی دل
افتخار سے محبت کرتی تھی۔ اور افتخار دل ہی دل میں باہر کسی ملک میں جانے
کا خواب دیکھتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ زاہدہ نے دل کی بات نہ کسی سے کہی

اور نہ اپنی تمنا کو کسی قسم کا عملی جامہ پہنایا۔ افتخار کے آبا یونیسکو والوں کے اچھی ط
تھے۔ اور افتخار کی تمناؤں کی عزّت کرتے تھے۔ فقط ایرپین کوشش جاری ہوئی
ایرپین ان لوگوں کو ابھی تین ماہ گذرے تھے کہ افتخار پیرس چلا گیا۔

آخری دن جب وہ کالج میں سب سے ملنے آیا تو زاہدہ چھٹی پر تھی۔ او
میں سفید چادر پر بیٹھی ناک پونچھتی ہوئی کھجور کی گٹھلیوں پر کلمہ پڑھ رہی تھی۔ اس
والد کے سوئم پر اپنی کلاس کی لڑکیوں نے بتایا کہ افتخار پیرس جا چکا ہے۔

سمور جیسی نرم شخصیت میں یکدم خار پشت جیسے نکیلے کانٹے نکل آئے
وہ جہاں بیٹھتی چھوٹے سے رومال سے آنکھیں پونچھتی رہتی۔ پہلے پہلے تو لڑکیو
اس پر بہت ترس کیا۔ ہر طرح سا تھ ملائے رکھنے کی باتیں کیں۔ لیکن ہر ایک اوق
ہائے میرے خدا کہہ کر لوٹی۔ زاہدہ بڑی کم گو اور چپ چپاں قسم کی لڑکی تھی۔ لیکن
زاہدہ کے منہ میں دو موہنے سانپ کی زبان تھی۔ خبر بھی نہ ہوتی اور ڈس لیتی۔
بیچاری الگ تھلگ بیٹھی رہتی اور کسی لڑکی کو پاس پھٹکنے کی ہمت بھی نہ پڑتی۔

ڈمپل اور رشّو کا تعلق خاطر ان سب سے مختلف تھا۔ کچھ تو رشّو ڈمپل کی
طبع اور لباس کی عمدگی سے مرعوب تھی۔ کچھ احسانمندی اور تشکر کا عنصر تھا جو
ان کے گھر رہ کر محسوس کرتی تھی۔ جب تک ماڈرن ہوسٹل میں جگہ نہ ملتی اسے ا
کے گھر نظریں جھکا کر جی ہاں جی ہاں کرتے گذارنا تھی۔

کچھ ایک اور وجہ بھی تھی جس نے رشّو کو بیک وقت حیران، متزلزل، ا

مرعوب کر رکھا تھا۔

ڈمپل میں ایک شانِ قلندری تھی۔ اس کا ہر فیصلہ ایک عنی کا فیصلہ تھا۔ کالج کے لڑکے اس کی بے داغ انگریزی اور اعلیٰ لباس سے ڈرتے تھے۔ براندرتھ روڈ والا باپ اپنی بیٹی سے اس لئے خوفزدہ تھا کہ اس لڑکی سے سارے گھر میں اجالا تھا۔ بس لڑکی سے سارے مستقبل کی امیدیں وابستہ تھیں۔ اس لڑکی کا خوبصورت لباس دیکھ کر کبھی کبھی آپا کو خیال آتا کہ اتنی ساری قیمتی ساڑھیاں ۱۰ ایسے خوبصورت کوٹ، یہ قیمتی جوتے میری آمدنی سے تو نہیں بن سکتے۔ لیکن آپا میں آنکھیں بوند کرنے کی وہ خوبی تھی، جو کبوتر میں بلی کو دیکھ کر پیدا ہوتی ہے۔

کوٹھے کے اوپر والے حصے میں کرایہ دار رہتے تھے۔ اور انہی کے کرائے پر مالکِ مکان کی بیشتر گزر بسر ہوتی تھی۔ ابھی رشّو کو اس گھر میں آئے آٹھ دس دن ہونے تھے کہ ڈمپل نے ایک دن رشّو سے کہا۔

"میرے ساتھ اوپر چلتی ہو؟"

"اوپر؟"

"اوپر تو ایسے پوچھتی ہو جیسے میں ٹرائیڈنٹ کے سفر کے لئے کہہ رہی ہوں۔"

"لیکن اوپر کیا کام ہے تجھے؟"

"کوئی کام نہیں صرف میل ملاقات . . . . . سوشل لائف . . ."

"نہیں بھئی تم جاؤ . . ."

"بابا بے ضرر ہے میاں بیوی ہیں۔ بیوی دمے کی مریض ہے۔ کھانستی رہتی ہے۔ کبھی ہومیوپیتھک علاج کرتی ہے۔ کبھی کورٹیزون کھاتی ہے۔ چلو تو سہی۔۔۔"

"کیا ایسا ہی ضروری ہے؟"

"مردم بیزار نہیں ہونا چاہئے۔ آدمی گریگیریس جانور ہے۔ آؤ چلیں۔"

گورشو نہیں جانتی تھی کہ اوپر والے کیسے ہیں۔ اور کیوں اس کا دل دھڑک رہا ہے؟ لیکن کوئی چیز اسے بتا رہی تھی کہ معاملہ اتنا صاف نہیں جتنا نظر آ رہا ہے۔

کرامیہ داد کی بیوی واقعی دمے کی مریض تھی۔

جب وہ اوپر پہنچیں تو وہ پیچ کا ڈریسنگ گاؤن پہنے اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہی تھی، بار بار وہ تپائی سے ایک شیشی اٹھاتی۔ سینٹ چھڑکنے والی شیشی کی طرح اس میں ربڑ کا ایک گیند سا لگا تھا۔ ناک میں نلکی ڈال کر جب وہ مریضہ اس گیند کو دباتی تو دوائی پھوار بن کر ان کی ناک میں داخل ہو جاتی۔ اور کچھ دیر کے لئے ان کا سانس ہموار ہو جاتا۔۔۔

ڈھیلی کو دیکھ کر کرامیہ داد کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اور اس کے ہونٹ خوشامد بھری مسکراہٹ میں پھیل گئے۔

"آئیے آئیے! اتنے دن بعد تشریف لائی ہیں آپ؟۔۔"

ڈھیلی اس کے پاس چارپائی پر بیٹھ کر بولی۔۔

"یہ ہیں مسز سید۔ اور یہ ہیں میری سہیلی رشیدہ میر۔۔ ہوسٹل میں سیٹ نہیں ملی

اسٹیٹس۔ کچھ عرصہ قیام کریں گی میرے پاس۔"
مسز سید نے ہنستے ہوئے چہرے پر گل و گلزار کی قسم کی کیفیت پیدا کر کے کہا۔
"کتنی اچھی بات ہے اور رونق ہو جائے گی یہاں۔"
"کہیے" اب طبیعت کیسی ہے آپ کی۔"
"ابھی آدھ گھنٹہ ہوا اٹیک شروع ہوا ہے۔ ورنہ پچھلے ہفتے تو اللہ کی بہت مہربانی رہی مجھ پر۔"
"ان کا ایک تو پٹرول پمپ ہے مال پر۔۔۔ دوسرے ان کے میاں ملازم ہیں کسی آئل کمپنی میں۔۔۔ ذرا نام بتا دیجیے اس آئل کمپنی کا۔۔۔"
بیوی نے جلدی سے نام بتا دیا۔
گو ڈمپل کو اس کمپنی کے اتنے کیلنڈر ڈائریاں مل چکی تھیں کہ اس کا نام بھول جانے کی گنجائش نہ تھی۔ لیکن یہ ان دونوں کا ایک کھیل تھا۔ تجاہلِ عارفانہ کا کھیل۔۔۔ مسز سید بظاہر یہ ظاہر کرتی تھی کہ ڈمپل اس کی دوست ہے۔ اور ڈمپل اپنے رویے سے یہ ثابت کرتی تھی کہ آئل کمپنی سے لے کر مسٹر سید تک اسے کسی چیز کا نام یاد نہیں رہتا۔
چائے پینے کے بعد جب وہ دونوں اٹھنے لگیں تو مسز سید نے اپنی قد آدم الماری کھولی اور اس میں سے ایک ایسا ڈبہ نکالا جس پر سنہری کاغذ چڑھا ہوتا ہے۔۔۔

"ایک چیز ہے تمہارے لئے ڈمپل۔۔۔"

"تو پلیز۔۔۔" ڈمپل نازک سا ہاتھ سینے پر رکھ کر بولی۔

"بس ہے۔۔۔ دیکھو تو پھڑک جاؤ گی۔۔"

جس وقت مسز سید گڈی کا غذ اٹھا کر ڈمپل کو پان سات سو کی ریشمی ساڑھی دکھا رہی تھیں اس وقت رشو صاحب کمرے میں آ گئے۔ رشو کو یوں وہم سا ہوا جیسے یہ آدمی ساتھ والے کمرے میں پہلے سے موجود تھا۔

"ہیلو۔۔۔ ڈمپل صاحبہ۔۔۔ ہاؤ آر یو۔۔۔؟۔۔۔"

"فائن۔۔۔۔ آپ سنائیے سید صاحب؟۔۔۔"

راجپوتی طرز کی تراشی ہوئی باریک باریک مونچھیں۔ ان کے نیچے گول سا ابھرا ابھرا دہن۔ کان ذرا باہر کو نکلے ہوئے۔ کدو کی طرح لمبا سر اور فراخ ماتھا۔ سید صاحب کا رنگ کچا کالا تھا۔ جو کہیں کہیں سے ڈھل کر صندلی اور کہیں کہیں سے گہرا سانولا لگتا تھا۔ ان کے رنگ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے زعم میں گندمی رنگ کے آدمی تھے۔ اور دوسروں کی نظروں میں بالکل سیاہ۔ گرمیوں میں ان کا رنگ اور ہوتا اور سردیوں میں اور۔ برسات میں بھادوں بدرنگ ہو جاتے۔ اور بہار میں ان کی کینچلی بدل جاتی۔ روپے پیسے کی ان کے ہاں کمی نہ تھی۔ پٹرول پمپ۔ آئل کمپنی کی نوکری کے ساتھ ساتھ ان کے کچھ نہری مربعے بھی ٹھیکہ پر چڑھے ہوئے تھے۔ اتنی ساری مثبت رقموں کے باوجود ان کا ٹوٹل بہت بڑے صفر ہی نکلتا تھا۔

لب کاٹتے ہوئے مسز سیّد بولیں۔

"یہ رنگ تو نہیں سجے گا ڈمپل . . . دیکھو تو . . ."

"خدا قسم میں اتنے ایکسپنسو تحفے نہیں لے سکتی آپ سے۔"

میاں بیوی نے لمحہ بھر کے لئے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ میاں نے اور اصرار کرنے کو کہا۔ تو مسز سیّد بولیں۔

"آپ ہمیں شرمندہ کرتی ہیں۔ بہے نا . . ."

"خدا قسم میں شرمندہ ہوتی ہوں . . . ایسے تحفے لے کر . . ."

مسز سیّد نے پھر لب کاٹا اور آہستہ سے بولیں۔

"آپ جانتی ہیں میرے لئے تو بیکار ہے یہ . . آپ قبول نہ کریں گی تو مجھے جمعدارنی کو دینا پڑے گی۔"

"ہائے پلیز . . . نو . . ."

ڈمپل نے جلدی سے ڈبہ پکڑ لیا

"ایسا ظلم تو نہ کیجئے گا۔"

"آپ مانتی جو نہیں ہیں . . ."

جتنی دیر تحفے کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ مسٹر سیّد بڑی خاموشی سے چوہے کی مانند بسکٹ کترتے رہے۔ جب یہ موضوع سرد پڑنے لگا تو مسٹر سیّد نے کالج کے متعلق باتیں شروع کر دیں۔ وہ کالج کے سرپروفیسر اور قریباً تمام لڑکوں سے بخوبی

واقف تھے۔ سائیکالوجی کی خاص خاص ٹرمینالوجی سے بھی اچھی طرح واقف تھے
جتنی دیر یہ علمی باتیں ہوتی رہیں رشو نے دیکھا کہ ڈمپل اور سید صاحب دونوں آرام
کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ سامنے پلنگ پر مسز سید گیند پچکا پچکا کر ناک میں دوائی
کی پھوار ڈال رہی تھیں۔ اور میز تلے براؤن بوٹ پر ڈمپل کی نرکدار سفید جرابی ٹکی تھی۔
مسز سید کی آنکھوں میں اچانک سفیدی کا حصّہ بہت بڑھ گیا تھا۔ اور وہ فیڈ
آوٹ ہوتے منظر کی طرح معدوم ہوئی جا رہی تھیں۔

"اچھا اب اجازت دیجئے آپا۔۔"

"ارے۔۔۔ ابھی سے" مسز سید پھر ان فوکس ہو گئیں۔

"بہت دیر ہو گئی ہے۔۔۔ ابھی ہمیں کچھ پڑھنا بھی ہے"

"ہائے اللہ۔۔۔ کچھ دیر تو بیٹھو ڈمپل۔۔۔ تم آجاتی ہو تو دل لگ جاتا ہے ہمارا"
ایک تیز سی نظر اپنے میاں پر ڈال کر انہوں نے کہا۔

"کل آؤں گی جی۔۔۔"

"ضرور۔۔۔ وعدہ کرو۔۔"

"اب جی وعدہ تو نہیں ہو سکتا۔۔۔ لیکن کوشش کروں گی۔"

"نہیں جی۔۔۔ وعدہ کرو۔۔"

"چلئے وعدہ ہی سہی۔۔۔" ڈمپل مسکرا کر بولی۔

"تو بہ یہاں کیا کھڑے ہیں۔ ٹارچ لے کر لڑکیوں کو زینہ دکھا آیئے ناں۔۔۔"

سیّد صاحب کچھ دیر الماری میں ٹارچ ڈھونڈتے رہے۔ آخر وہ ان کی جیب سے برآمد ہو گئی اچانک . . .

"رشیدہ صاحبہ! چھ مہینے سے ہمارے زینے کی وائرنگ خراب ہے لیکن انہیں فرصت بھی ہو اسے ٹھیک کرانے کی . . . خدا کے لئے اس میں نئی وائرنگ کرائیں آج کل میں . . ."

"اچھا بھئی کل ہی سہی . . ."

"آپ کی کل بھی دیکھی ہوئی ہے۔ دھیان سے راستہ دکھا دیجئے گا . . ."

پتہ نہیں ٹارچ کے سیل پرانے تھے کہ اس کا سوئچ خراب تھا۔ بیس باتیس سیڑھیوں میں آٹھ دس دفعہ روشنی بند ہوئی۔

جب وہ دونوں اپنے کمرے میں لوٹ آئیں تو رشو نے ڈرتے ڈرتے سنہری پٹی والے ڈبے کو ہاتھ لگایا۔ گڈی کاغذ کھولا۔ اور بڑی جرأت سے بولی۔

"یہ . . . یہ تحفہ کیسے دے دیا مسز سیّد نے ممی؟"

"دینا ہی پڑتا ہے تحفہ وغیرہ . . . ایسی صورت میں . . ."

"کیا مطلب ؟"

"ایسی باتوں کا مطلب وطلب نہیں پوچھا کرتے۔ سو جاؤ آرام سے۔"

"اور پڑھائی؟ . . . پڑھو گی نہیں تھوڑی دیر . . ."

"میں تو بہت تھک گئی ہوں . . . شب بخیر۔"

بغیر کپڑے بدلے، بغیر نائلون کی باریک جرابیں اتارے وہ بیڈ لیمپ کی طرف

پشت کر کے لیٹ گئی اور تکیے پر سر رکھتے ہی سو گئی۔

رشنو رات گئے تک گم سم کتاب سامنے رکھے بیٹھی رہی۔ کبھی اس کی نظر ڈبیا کی پشت پر جاتی۔ کبھی اس کی نگاہ سنہری ڈبیا کا طواف کرتی۔ کبھی سوچتی اس لڑکی کا ضمیر ہے کہ نہیں۔ پھر کرتی اس کے دل کو سمجھاتا کہ چوری تھوڑی ہے۔ مسز سید نے چار آدمیوں کے سامنے بہ اصرار تحفہ دیا۔ اس میں چوری کیسی؟

اسی سوچ میں نہ جانے اسے کب نیند آ گئی؟

جوانی کی نیند شاید ایسی ہی ہوتی ہے۔ لاکھ جسم کا توازن بگڑے۔ لاکھ ذہن میں گہرے رنگ کا مغز پانی میں بدلتا جائے۔ نیند تو اس طرح ٹوٹ کر گرتی ہے جیسے پانی میں کھڑا کھڑا درخت نیوڑا کر گرے۔ یہ اور بات ہے کہ ملک صاحب کی بیگم عمر کے اس دور میں داخل ہو چکی تھیں جہاں پہنچ کر محبت کی طلب تو بہت ہوتی ہے لیکن محبت کی جملہ ضروریات کو جسم پورا کرنے سے قاصر ہو جاتا ہے۔ اور اسی لئے نیندیں اپنے بس میں نہیں رہتیں۔

ملک صاحب اور بیگم صاحبہ نے پورے بیس سال ایک دوسرے کی محبت میں سرشار ہو کر کاٹے تھے۔ جب نئی نئی شادی کے بعد ملک صاحب آبادان اپنی بیوی کے ساتھ گئے تو اپنے کام پر جاتے وقت ملک صاحب کا دل بیٹھ جایا کرتا تھا۔ آبادان سے واپسی پر وہ اچھے خاصے امیر ہو چکے تھے۔ وطنِ عزیز لوٹے تو لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ رشتہ داروں نے کلغی کی طرح اپنے ماتھوں پر سجایا۔ حیثیت

عمر ڈھلتے ہی شہر میں ان کی ساکھ بڑی منہ زور گھوڑی کی طرح گردن اکڑاتے پھرنے لگی۔

یہ عہد ان کی زندگی کا بہترین عہد تھا۔ اللہ نے پانچ بچے عطا کئے۔ اظہر، مظہر اور ظفر۔۔۔ سب سے بڑی بیٹی شائستہ تھی اور سب سے چھوٹی بچی کا نام نازلی تھا۔

نازلی تک پہنچتے پہنچتے ملک صاحب اور بیگم صاحبہ ازدواجی زندگی سے اس طرح اُوب گئے تھے جیسے حلوائی مٹھائیوں کے تھال دیکھ دیکھ کر مٹھائی سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ ملک صاحب نے سرجیکل اوزاروں کی فیکٹری بنا کر اپنے آپ کو ڈاکٹروں کی قینچی، مورچنے اور چھریوں کے حوالے کر دیا تھا۔ بیگم صاحبہ کے لئے پہلے سر درد کا عارضہ تفریح کا باعث ہوا۔ پھر سارا سارا دن ملک صاحب کی توجہ کی طلب اور ملک صاحب کی عدیم الفرصتی کے باعث چارپائی کا سہارا لیا جانے لگا۔ یہ معلوم نہیں کہ ملک صاحب کی طرف سے بے توجہی پہلے شروع ہوئی کہ بیگم صاحبہ کی صحت پہلے بگڑی۔ یہ بھی چھان پھٹک کر بتایا نہیں جا سکتا کہ دونوں کس طرح اور کیسے ایک دوسرے کو گھر کا پرانا فرنیچر سمجھنے پر مجبور ہوتے۔ یہ بھی واضح نہیں کہ ان دونوں میں سے بظاہر سب کچھ طاق نسیاں پر رکھنے کے باوجود کون ماضی کو سینے سے لگائے بیٹھا تھا لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ بیگم صاحبہ کی صحت پچھلے سات آٹھ سالوں میں بہت بگڑ چکی تھی۔

ڈاکٹروں سے مشورہ ہوا تو پتہ چلا کہ رحم میں گریپ فروٹ جتنی بڑی رسولی ہے۔ جب اس رسولی کے پھٹنے یا کینسر میں تبدیل ہونے کا احتمال ہوا تو چھ انچ

پیٹ کاٹ کر یہ رسولی نکال گئی۔

علاوہ اس وقت جب بیگم صاحبہ بے ہوشی کے عالم میں سرجری کی میز پر پڑی تھیں۔ ڈاکٹروں نے متفقہ فیصلہ کیا کہ رحم کو اس رسولی سے اس قدر گزند پہنچ چکا ہے کہ اب اس کو جسم میں رکھنے کا یہی مطلب ہے کہ جیسے ہری بیل کے ساتھ سوکھی توری لگی رہنے دی جائے۔ اسی وقت ملک صاحب سے اجازت طلب کی گئی اور بیگم صاحبہ کا رحم جس نے پانچ بچوں کو اپنے اندر نو ماہ تک پالا خربوزے کے بیجوں کی طرح نکال کر باہر پھینک دیا گیا۔

کنڈر فر ڈے میں جب رسولی اور رحم نکال کر ملک صاحب کے پاس ایک سیاہ فام نرس پہنچی تو ملک صاحب کو یوں محسوس ہوا جیسے نرس کسی غیر عورت کی باتیں ان سے کر رہی ہے۔

خدا جانے یہ رحم نکل جانے کے باعث تھا کہ عورت کی عمر چالیس کے پیٹے میں پہنچ کر خود بخود مردانہ پن کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ بہر کیف چہرے پر مونچھوں کے بال اور چاہِ ذقن کے ارد گرد پلکوں جیسے موٹے اور خمدار بال نکلنے لگے۔ وہی حلق جس سے پہلے کویل جیسی تیکھی آواز نکلتی تھی۔ اب پہاڑی کوّے کی طرح بولنے لگا۔

یہ تو وہ تبدیلیاں تھیں جو ظاہری تھیں لیکن ایک ایسی تبدیلی تھی جس کا ذکر بیگم صاحبہ نے کسی سے نہ کیا تھا۔ جب انہیں خبر ملی کہ رحم تو ظالم سرجنوں نے رسولی کے ساتھ ہی نکال پھینکا تو فوراً ان کے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا کہ اب وہ عورت نہیں

رہیں۔ لاکھ بیرونی ممالک سے پڑھ آئے ڈاکٹروں نے ان کی تشفی کی کہ رحم کا عورت کی نسوانیت اور اس کی شادی شدہ زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کا تعلق اگر ہے تو ان بچوں سے ہے جنکو جننے کی بیگم صاحبہ کو خواہش نہیں۔ لیکن ان کے دل کے کنویں میں تو رتی سے ٹوٹ کر ڈول گر چکا تھا۔ اوپر سے چہرے پر بن بلائے بالوں نے اس شبہ کو تقویت دی تھی۔ پہلے انہوں نے ملک صاحب کا کمرہ چھوڑا پھر اپنے آپ کو کنبے کی بے شمار مہمان داریوں کے سپرد کر دیا۔

پتہ نہیں بیگم صاحبہ نے ملک صاحب کا کمرہ پہلے چھوڑا تھا یا ملک صاحب محض مارے مروت کے تیسری منزل پر نہ جاتے تھے۔ بہر کیف جب وہ تیسری منزل پر مستقل طور پر مقیم ہو گئے تو بظاہر نہ اس طرف استفسار ہوا نہ ادھر انکار۔۔۔ دونوں اس طرح علیحدہ ہو گئے۔ گویا دو گاڑیاں اپنا اپنا ڈبہ کٹ کر کے ایک دوسرے کو کراس کر گئی ہوں۔۔۔

کہتے ہیں کہ ابھی اس صدی کے شروع تک ٹراونکور کے علاقے میں دیوداسیاں مندروں میں رہا کرتی تھیں۔ کنچنی، گھرا چکلا کی لال بتی، خانگی، پریشان، یا لولی سے دیوداسی اس طرح مختلف تھی کہ ان سے سوسائٹی کا ایک ایسا طبقہ وابستہ تھا جو ان کی عزت کم کرنے کے بجائے ان کی اہمیت اور عزت دونوں میں اضافہ کرتا تھا۔ پروہت اور مندر کی سیوا ان کا دھرم تھا۔

ایسی دیوداسی جس کے حسن اور رس بھرے گیتوں نے مندروں میں اجالا کر

رکھا ہو جب عمر کے اس حصے میں پہنچتی ہے جب ڈاڑھی کے بال نمایاں اور حلقوم سے پہاڑی کوے کی سی آواز نکلتی ہے تو ایسی دیوداسی مندر کی چوکھٹ پر سیس نوا کر عرض کرتی ہے کہ مجھے اپنے جھمکے اتارنے کی اجازت دی جائے۔

جھمکا اتارنے کی اجازت باضابطہ طور پر دی جاتی ہے۔ مہاراجہ کے محل میں اس رسم کی ادائیگی بڑے طمطراق سے کی جاتی ہے۔ مہاراجہ کے جلو میں وہ افسران با اختیار ہوتے ہیں جنہیں ضرورت پڑنے پر شہادت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت بوڑھی دیوداسی لکڑی کے خالی تختے پر بیٹھ کر اپنے کانوں کے جھمکے اتارتی ہے۔ ان کے ساتھ اپنی گرہ سے مہاراجہ کا نذرانہ رکھ کر وہ تختے سے اٹھتی ہے۔ اور ان جھمکوں کی طرف ایک بار بھی دیکھے بغیر دربار سے رخصت ہو جاتی ہے۔

اگلے دن کے بعد گو یہی جھمکے اسے لوٹا دیئے جاتے ہیں۔ لیکن انہیں پہننے کی اسے کبھی اجازت نہیں ملتی۔

اب وہی مندر جس میں کچھ عرصہ پہلے اس کی کلا جگ رہی تھی۔ یہاں وہ ایسے رہتی ہے جیسے کسی ویلفیئر سیٹ کے غریب خانے میں معذور بزرگ رہتے ہیں۔

ظفو کی والدہ نے باضابطہ طور پر جھمکے تو نہ اتارے تھے لیکن وہ مندر کی زندگی سے دستبردار ضرور ہو چکی تھیں۔ یوں کمپلیٹ ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے اپنے گھر کو جو روپ دیا وہ ان کی پٹی ہوئی زندگی کا شاہد تھا۔

تین جوان بیٹوں اور دو بیٹیوں کی ماں کچھ تنہا نہیں ہوتی۔ وہ بھی جب بڑے

دونوں بیٹے اور بڑی لڑکی شادی شدہ ہو۔ لیکن اماں تو لمحہ بھر کے لیے اپنے آپ کو اکیلے ہی رد بر ولا نانہ چاہتی تھیں۔ ہر وقت انھیں میلہ گھومنی کی طرح اپنے اردگرد میلہ اچھا لگتا۔ بھانجیاں، بھتیجیاں، بڑے لڑکوں کے سمدھیانے، بڑی بیٹی کے سسرال والے وقت بے وقت چلے آرہے ہیں۔ گھر کی شکل و صورت کارواں سرائے کی ہو گئی۔ تو لیے پر کھانا چنا جارہا ہے۔ پردوں سے ہاتھ پونچھے جارہے ہیں، چارپائیوں پر ٹرنک دھرے ہیں۔ ٹرنکوں پر مہمان لدے ہیں۔ مہمان ہیں کہ ایک آتا ہے دوسرا جاتا ہے۔ ساڑھے گیارہ سے لے کر چار سوا چار تک دوپہر کا کھانا چلتا ہے۔ منہ اندھیرے بھینس کے آگے چارہ دانہ ڈال کر چائے کی کیتلی چڑھتی ہے تو دوپہر تک انڈے پراٹھوں کی خوشبو باورچی خانے سے چلی آتی ہے۔ اماں کی خوش خلقی اور انکسار و محبت کی سب تعریف کر رہے ہیں۔ ملک صاحب تیسری منزل پر رہتے ہیں اور تیسری منزل سے اماں کے کرے میں ٹوٹوٹی کا حقہ پرنالہ چپ چاپ بہتا ہے۔ نہ اماں مانگنے جاتی ہیں نہ ملک صاحب کبھی دیتے ہوئے باز پرس کرتے ہیں۔

اسی سارے تین منزلہ مکان میں ظفر اور ملک صاحب پال میں پڑے ہوئے آٹوما جیسی زندگی گذار رہے ہیں۔ اظہر اور مظہر اپنی اپنی بیوی اور اپنی اپنی دوکان کے درمیان پنگ پانگ بال کی طرح اچھل اچھل کر بڑی مصروف زندگی بسر کر رہے تھے۔ ظفر کے لئے اس گھر میں جس سکون کی ضرورت تھی وہ اسے تیسری منزل پر بھی نہ ملتا۔

جب سے رشنو کو خط لکھنے کا سلسلہ بند ہوا تھا۔ وہ اپنے جذبات پر کارک